بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اُمّتِ مُسلمہ پر استعمار اور صہیونیت کا مشترک حملہ

اُمّتِ مُسلمہ کا موجودہ منظر نامہ تہ در تہہ انتشار اور اضمحلال کی تصویر ہے۔ مشرقِ وسطیٰ میں مذہبی اور سیاسی کشمکش اس درجہ دگرگوں ہو چکی ہے کہ بعض مبصرین اس اندیشے کا اظہار کر رہے ہیں کہ خلافتِ عباسیہ کے بعد قائم ہونے والی فاطمی حکومت ایک مرتبہ پھر مشرقِ وسطیٰ میں اپنا سیاسی اور استبدادی تسلّط قائم کرنے کی پوزیشن میں نظر آ رہی ہے۔ یہ صورتِ حال پورے خطے کی سنی آبادی کے لیے کسی خطرے کی گھنٹی سے کم نہیں ہے۔ مصر میں الاخوان المسلمون کی سیاسی جدوجہد نتیجہ خیز ہوئی تو ملک کی سیکولر مغرب نواز قوتوں نے فوجی جبر و تشدد کے ذریعے ایک منتخب اسلام پسند اور قرآن و سنت کی حکمرانی کی دعویدار حکومت کو فوجی انقلاب کے ذریعے ختم کر کے سیاسی جدوجہد کے راستے سے اسلام کی سربلندی کا خواب دیکھنے والوں کی امیدوں پر پانی پھیر دیا اور ایک طویل مدت کے لیے نا امیدی کے سائبان تان دیے۔ اس حادثہ فاجعہ سے بھی بڑا سانحہ یہ ہوا کہ مصر کے فوجی انقلاب کی حمایت اور اس کے معاونین کی فہرست میں سعودی حکومت سرخیل کی صورت میں سامنے آ گئی اور نتیجتاً دنیا بھر کی اسلامی تحریکات کی توقعات اور امیدوں کا فکری تانا بانا منتشر ہو کر رہ گیا۔

سعودی عرب کے حکمران طبقے کے اس کردار کے حوالے سے اُن اصحابِ دانش کی رائے میں وزن نظر آتا ہے جو سعودی حکمرانوں کے موجودہ طرزِ عمل کو آلِ سعود کی جانب سے برطانوی مفادات کی عالمی سطح پر حمایت کرنے کے بدلے میں آلِ سعود کی نسل در نسل حکمرانی کے حق کو برقرار رکھنے کے معاہدے کے ساتھ جوڑتے ہیں۔ ایک صدی قبل جس دور میں یہ معاہدہ روبعمل لایا گیا تھا اُس وقت برطانیہ ایک عالمی قوت کی حیثیت رکھتا تھا' آج وہی قوت شمالی امریکہ کو حاصل ہے' جبکہ آلِ سعود میں سے بعض کردار بھی قصۂ ماضی بن چکے ہیں اور بعض نئے کردار منصۂ شہود پر ہیں... گویا ڈرامہ وہی پرانا ہے لیکن کردار نئے ہیں۔

مشرقِ وسطیٰ میں جاری حالیہ بدامنی اپنے اہداف اور عسکری طریقِ کار کے اعتبار سے ابہامات (confusions) کا شکار ہے۔ ''معتبر'' ذرائع کے مطابق متعدد غیر سُنّی فرقے اور قبائل داعش (ISIS) کی جارحیت کا شکار ہیں۔ یزیدی فرقہ خاص طور پر اس جارحیت کا اس لیے شکار بتایا جاتا ہے کہ داعش کے جنگجوؤں نے مبینہ طور پر اُس پہاڑ کو گھیر رکھا ہے جس پر اس فرقے کی آبادی ہے۔ شمالی عراق کی طرف سے شدت پسندوں کے حملوں کے نتیجے میں متعدد آبادیوں کے انخلا اور پانچ سو کے قریب یزیدی فرقہ کے لوگوں کے قتل کو جواز بنا کر اور علاقے کے عیسائیوں کے تحفظ کے عنوان سے امریکہ ۲۰۱۱ء میں بھی فضائی حملے کر چکا ہے اور اب نئے حملوں کی بڑے پیمانے پر تیاری

ہے۔ امریکی فوجی ذرائع اس صورتحال کو پورے مشرقِ وسطیٰ میں پھیلتا دیکھ رہے ہیں۔ داعش کی سرگرمیاں چیک ہیگل (سیکریٹری ڈیفنس) کے خیال میں تاریخ کے خوفناک ترین عوامل میں سے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ داعش کی ان انتہاپسندانہ سرگرمیوں کا اصل محرک اور منتہائے مقصود کیا ہے؟ اس بات کو سمجھنے کے لیے ماضی کے بعض اہم واقعات کو دُہرانا ناگزیر ہے۔

ماضی قریب میں صدام حسین کے بعد سے امریکہ کی پروردہ نوری کامل محمد حسین المالکی کی شیعہ حکومت کے آٹھ سالہ دورِ حکومت میں سُنّی آبادی کے ساتھ کیے گئے برتاؤ سے خطے کی پوری سُنّی آبادی شدید قسم کے عدمِ تحفظ کا شکار رہی ہے۔ چونکہ ظلم کا معاملہ امریکہ کی براہِ راست نگرانی اور سرپرستی میں جاری رہا ہے اس لیے سُنّی آبادی کا اپنے حقوق اور مفادات کے تحفظ کے لیے کسی دوسرے راستے کو موجود نہ پانا انہیں دراصل دیوار کے ساتھ لگانے کے مترادف تھا۔ چنانچہ ایک شدید ردِعمل تھا جو بیک وقت شیعہ حکمران طبقے اور امریکہ کے خلاف ایک لاوے کی صورت میں پکتا رہا۔

شیعہ سُنّی منافرت کا یہ مسئلہ بظاہر ایک علاقائی اور حالیہ معاملہ نظر آتا ہے‘ مگر اس کی جڑیں اس سے کہیں گہری اور وسیع ہیں۔ وسعت کے اعتبار سے اگر یہ کہا جائے کہ اس بحران کے اصل محرک‘ سکرپٹ رائیٹر اور اصل کھلاڑی عالمی استعماری پلیئرز ہیں تو ہرگز غلط نہ ہوگا۔ یادش بخیر‘ اٹھارہویں صدی کے وسط میں آلِ سعود کا محمد بن عبدالوہابؒ کی مدد سے نجد کے بعض قصبوں سے اٹھنے والی شرک اور بدعات وخرافات کے خاتمہ کی تحریک نے شمال کی سمت میں پھیلتے پھیلتے انیسوی صدی کے آغاز تک عراق کے متعدد علاقوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور ۱۸۰۳ء میں کربلا کا علاقہ بھی حملوں کی زد میں آ گیا تھا۔ یہاں فتوحات پالینے کے بعد آلِ سعود کا رُخ جب حجاز کی طرف ہوا تو عالمِ اسلام میں بے چینی پیدا ہوئی جس سے ان فتوحات کا زور تھم گیا۔ حجاز کی مرکزیت کی اصل وجہ مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ تھے۔ ان شہروں پر نجدی تحریک کا تسلط خلافتِ عثمانیہ کے لیے ناقابلِ قبول تھا۔ لیکن اپنی سیاسی اور عسکری کمزوریوں کی وجہ سے خلافتِ عثمانیہ کو مکہ اور مدینہ بازیاب کروانے میں شدید مشکلات کا سامنا تھا۔ اس مقصد کے لیے خلیفہ کو مصر میں اپنے قابل اعتماد کمانڈر محمد علی کی خدمات حاصل کرنا پڑیں۔ اس معرکہ نے علاقے کی سیاست کو ایک نیا رُخ دے دیا۔ حجاز اگرچہ دوبارہ ۱۸۱۸ء تک مکمل طور پر خلافتِ عثمانیہ کے زیر تسلط آ گیا‘ لیکن خلافتِ عثمانیہ اور ترکوں سے عربوں کی مخالفت اور مخاصمت شدید تر ہوتی چلی گئی۔

آلِ سعود کی یہ نجدی تحریک اندرونِ خانہ جاری رہی اور شرک اور بدعات وخرافات کے خاتمہ کی جدوجہد کے لیے عسکری منہج بھی اپنے دلائل اور نظریات کے ساتھ پھیلتا رہا۔ البتہ اس کارِ خیر کے لیے پیدا شدہ ایمانی جذبات اُعداء کے لیے بھی بسہولت استعمال ہوتے رہے اور تاحال ہو رہے ہیں۔ یہ کیسے ہوا... اس کی بھی ایک الگ کہانی ہے۔ تاجِ برطانیہ نے خطے میں مذہبی جذبات اور اختلافات کو کیسے اپنے استعماری مقاصد کے لیے استعمال کیا‘ اسے جاننے کے لیے بیسویں صدی کے بالکل شروع کے حالات پر سرسری نگاہ ڈالنا مفید ہوگا۔

آج سے لگ بھگ سو برس قبل جملہ بلادِ عرب خلافتِ عثمانیہ کا حصہ تھے۔ ہر علاقے میں مضبوط قبائلی سردار بطور گورنر یا امیر کی حیثیت میں عثمانی خلیفہ کے ماتحت علاقے کے نظم ونسق اور مالی معاملات کے ذمہ دار متصور

ہوتے تھے۔ گویا پورے خطے میں لوگوں کو تجارت وصنعت سمیت مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے لیے آمد ورفت کی پوری آزادی نصیب تھی۔ مسلم دنیا کی یہ شیرازہ بندی مغربی استعمار کے توسیع پسندانہ عزائم کی راہ میں یقیناً ایک بہت بڑی رکاوٹ تھی' جس کا دور کیا جانا ان کے لیے ازبس ضروری تھا۔

یوں تو پہلی جنگِ عظیم کا آغاز جولائی ۱۹۱۴ء میں بلقان کی جنگ سے ہوا' لیکن اس کے لیے ماحول نصف صدی قبل سے مشرقی یورپ میں طاقت کے توازن میں بگاڑ اور بعض ممالک کے مابین تنازعات سے بننا شروع ہو چکا تھا۔ پورے یورپ میں سیاسی' معاشی اور علاقائی بنیادوں پر جوڑ توڑ کا سلسلہ جاری تھا اور بہت سے بین الملکی معاملات میں عسکری اتحاد' استعماریت اور قومیت سر اُٹھا چکی تھی۔ برطانیہ کے سیاسی اور عسکری پنڈت ان حالات میں مسلم ورلڈ کے حالات کو بغور دیکھ رہے تھے اور استعماریت کے لیے بلادِ عرب اور مڈل ایسٹ کو تقسیم در تقسیم کے مرحلے سے گزارنا لازمی تھا۔ لیکن اس کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ' جیسا کہ عرض کیا گیا' خلافتِ عثمانی تھی جو باوجود تہہ در تہہ کمزوریوں کے مسلمانوں کے اتحاد اور یگانگت کی علامت تھی۔ برطانوی استعمار کو اپنے مقاصد کے لیے سب سے پہلے مسلمانوں کے قلب پر حملہ کرنا تھا۔ اس کے لیے انہیں حجاز میں سب سے آسان شکار دستیاب ہو گیا۔ شریف حسین بن علی جو کہ مکہ کا امیر تھا' اس نے اقتدار اور مال کے وعدوں کے بدلے میں تاجِ برطانیہ سے خلافتِ عثمانیہ کے خلاف بغاوت کا علم سربلند کرنے کا معاہدہ کیا۔ تاجِ برطانیہ نے پیسے اور اسلحے سے بھرپور مدد کی۔ شریف حسین نے ۱۹۱۶ء میں مسلح بدوؤں کے لشکر کے ساتھ خلافتِ عثمانیہ کی افواج کو ہزیمت سے دوچار کیا اور برطانوی آرمی اور بحریہ کی مدد سے پورے حجاز بشمول جدہ اور مکہ کو خلافت سے ''آزاد'' کروا کر ''عرب بغاوت کا عَلَم'' سربلند کر دیا۔ یہی علم بغاوت بعدازاں دیگر مشرقِ وسطائی ریاستوں اردن' فلسطین' سوڈان' شام اور کویت کے لیے بھی ایک مثالی ماڈل قرار پایا۔

1917-18ء میں جب یورپ جنگِ عظیم اوّل کی لپیٹ میں آ چکا تھا اسی دوران ان عرب بغاوتوں کے باعث خلافتِ عثمانیہ کا سورج مشرقِ وسطیٰ سمیت پورے مسلم ورلڈ میں غروب ہو رہا تھا۔ برطانیہ جب اپنی فوجوں کو فاتحانہ طور پر فلسطین اور عراق میں داخل کر رہا تھا' اُسی وقت عربوں کی باغی افواج عمان اور خلیج عقبہ پر عثمانیوں کے خلاف لشکر کشی کر کے برطانیہ کی قوت کو دوچند کرنے میں مشغول تھیں۔ برطانوی کیپٹن لارنس نے عربوں کے ہاتھوں خلافتِ عثمانیہ کو پارہ پارہ کرنے میں جو کردار ادا کیا اسے آج بھی تاریخ میں ایک لازوال لیجنڈری کردار کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ شریفِ مکہ سے مصر میں برٹش ہائی کمیشن کی خط و کتابت سے پتا چلتا ہے کہ تاجِ برطانیہ سے ہونے والے معاہدہ میں شریفِ مکہ کو عثمانیوں کے خلاف بغاوت کے صلہ میں جنگ کے بعد پورے عرب بشمول شام اور عراق کی بادشاہت کا وعدہ کیا گیا تھا۔ لیکن یہ وعدہ اس لیے ایفاء نہ ہو سکا کہ برطانیہ نے اپنے استعماری مقاصد کے لیے بعض فریقوں (stake-holders) سے درپردہ ایسے معاہدات بھی بیک وقت (simultaneously) کر رکھے تھے جو شریفِ مکہ سے کیے گئے معاہدوں سے متصادم تھے۔ ان میں سے سب سے معروف معاہدہ وہ ہے جو برطانیہ اور فرانس کے مابین ۱۶۔1915ء میں مشرقِ وسطیٰ کی تقسیم (بلکہ بندر بانٹ) سے متعلق تھا۔ برطانیہ کے سر مارک سائیکس اور فرانس کے جارجیس پیکاٹ کے مابین ہونے والے اس معاہدہ کی

رو سے جنگ کے خاتمہ پر برطانیہ کو پورے عراق' کویت اور اردن پر قابض ہو جانا تھا اور فرانس کے حصہ میں شام' لبنان اور جنوبی ترکی کے علاقے آنے تھے' جبکہ فلسطین کی قسمت کا فیصلہ فریقین نے صہیونی عزائم کو پیش نظر رکھتے ہوئے مؤخر کیا۔ یہ معاہدہ چونکہ شریفِ مکہ سے کیے گئے معاہدہ سے براہ راست متصادم تھا اس لیے برطانیہ کو عرب' خاص طور پر حجاز اور نجد میں نئے حلیف درکار تھے۔ اس کے لیے ان کی نظر انتخاب آلِ سعود پر تھی جو پہلے سے ہی اقتدار اور علاقائی غلبہ و تسلط کی دوڑ میں شریک تھے۔ چنانچہ برطانیہ نے ۱۹۱۵ء میں آلِ سعود کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جسے دارِن پیکٹ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس معاہدے کی رُو سے آلِ سعود کو نجد کے علاقے میں اقتدار کی یقین دہانی کروائی گئی اور بدلے میں عربوں سے کویت' قطر اور امارات الساحل المتصالح (جو خلیج فارس کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی ساحلی آبادیوں پر مشتمل تھی)' کی سرحدی آزادی و خودمختاری قائم رکھنے اور برطانوی استعمار کو ان علاقوں میں قبول کرنے اور پورے خطے کو برطانوی استعمار کے زیر نگرانی علاقہ (protectorate) تسلیم کرنے کی شرط منوائی گئی۔ اِن مقاصد کو حاصل کرنے کے بعد ۱۹۲۷ء میں یہ معاہدہ ایک دوسرے معاہدے سے بدل دیا گیا جسے ''جدہ کا معاہدہ'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس معاہدے کی رُو سے آلِ سعود کو پورے حجاز اور نجد پر نسل در نسل حکمرانی کا حق دیا گیا اور ایک نئی جغرافیائی حد بندی کے ساتھ ''آلِ سعود'' کی نسبت سے المملكة العربية "السعوديه" کے قیام کی حمایت کا وعدہ کیا گیا۔ بدلے میں مشرقِ وسطیٰ کی دیگر آزاد ریاستوں کی حدود کا احترام' ان پر حملے نہ کرنے کی یقین دہانی اور علاقائی اور بین الاقوامی معاملات میں برطانیہ کی حمایت اور طرفداری کا وعدہ لیا گیا۔

عربوں کے ساتھ متذکرہ بالا معاہدات (شریف حسین کے ساتھ ۱۹۱۵ء میں کیے گئے McMohan Agreement اور آلِ سعود کے ساتھ ۱۹۱۵ء میں دارن پیکٹ اور بعد ازاں ۱۹۲۷ء کا معاہدۂ جدہ) اگرچہ اپنی جگہ پر عربوں کی کشمکش اقتدار اور برطانوی استعمار کی عیاری کا مظہر ہیں اور استعماری قوتوں کی وسیع تر پلاننگ اور علاقہ پر غلبہ اور وسائل پر قابو پانے کی کوششوں کا حصہ ہیں' لیکن بین السطور ایک اور تباہ کن معاہدہ بھی عمل میں لایا گیا جس کی پورے طور پر تکمیل ابھی شرمندۂ تعبیر ہے۔ یہ وہ بدنامِ زمانہ معاہدہ ہے جو مشرقِ وسطیٰ میں مستقل بنیادوں پر بدامنی اور عسکریت کا باعث ہے۔ اس معاہدے کو تاریخ میں ''بالفور ڈیکلریشن'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ نومبر ۱۹۱۷ء میں برطانوی فارن سیکرٹری آرتھر بالفور نے صہیونی سرکردہ لیڈر راتھ چائلڈ کو ایک خط تحریر کیا جس میں فلسطین میں ایک آزاد یہودی ریاست کے لیے تاجِ برطانیہ کی مکمل حمایت اور تعاون کا یقین دلایا گیا۔

قارئین کے لیے یہ بات تعجب اور دلچسپی کا باعث ہوگی کہ جہاں ایک جانب اسرائیل کی ناجائز ریاست کے قیام کے پس پردہ برطانوی سامراج کے صہیونیوں سے ۱۹۱۷ء میں کیے گئے بالفور ڈیکلریشن اور برطانوی استعماری عزائم کا دخل ہے' تو وہیں دوسری جانب ۱۹۳۲ء میں المملكة العربیہ السعودیہ کے قیام کے پیچھے بھی برطانوی استعماری عزائم کے لیے آلِ سعود سے کیے گئے ۱۹۱۵ء اور ۱۹۲۷ء کے معاہدات کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ گویا بلادِ عرب کو موجودہ ''سعودی عرب'' میں بدل کر مشرقِ وسطیٰ میں آزاد شہنشاہیت کو فروغ دینا اور یہودیوں کو عربوں کے علاقے میں آباد کروا کر عربوں کو مستقلاً تنازعات میں الجھانا اصل میں ایک ہی سازش کے

دو رُخ ہیں جو اسلامی دنیا کے اتحاد و شیرازہ بندی کو توڑنے اور ان کے وسائل پر قابو یافتہ ہونے کی بڑی سازش کا حصہ ہیں۔ چنانچہ عراقیوں' شامیوں اور اردنیوں کے مابین نصف صدی سے جاری اختلافات و تنازعات کی اصل بنیاد یہی متضاد معاہدات ہیں جو تاجِ برطانیہ نے مختلف فریقوں سے خفیہ طور پر کیے۔

بالفور ڈیکلریشن کے نتیجے میں ۱۹۴۸ء میں جس اسرائیلی ریاست کے قیام کی بنیاد پڑی تھی وہ ریاست صیہونی عزائم کے مطابق ابھی تکمیلی مراحل تک نہیں پہنچ پائی۔ صیہونیت ایک خالص سیاسی تحریک ہونے کے باوجود اپنا ایک مذہبی تشخص اور نظریہ رکھتی ہے۔ یہود کی مذہبی کتب میں Promised Land یعنی ''ارضِ موعود'' کا تذکرہ ملتا ہے۔ ارضِ موعود کا ذکر پیدائش (Genesis)' خروج اور استثناء (Deuteronomy) میں موجود ہے جو تھوڑے سے فرق کے ساتھ اُسی جغرافیائی حدود کی نشاندہی کرتا ہے جو دورِ جدید میں گریٹر اسرائیل (Greater Israel) کے نقشوں میں ظاہر کیے گئے ہیں۔ اس میں موجودہ اسرائیل' جملہ فلسطینی علاقے' لبنان' شام' اردن' عراق اور شمالی سعودی عرب شامل ہیں۔ بعض دوسری مذہبی روایات کے مطابق کویت' پورا سعودی عرب' عرب امارات' عمان' یمن اور ترکی کا بیشتر جنوبی علاقہ بھی اس نقشے میں شامل ہے۔ گریٹر اسرائیل کا قیام صیہونیت کا وہ نامکمل ایجنڈا ہے جس کی تکمیل کے لیے مشرقِ وسطیٰ میں بعض نئے اور بیشتر پرانے مہرے دانستہ و نادانستہ سرگرمِ عمل ہیں۔

یہ ہے وہ تاریخی پس منظر جس کے تناظر میں مشرقِ وسطیٰ کے حالات کو بالخصوص اور پورے مسلم ورلڈ کو بالعموم دیکھنے سے اُن عزائم کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے جو اَعداء اللہ' اَعداء الرسول اور اَعداء الناس کے پیش نظر ہیں۔ اسی تجزیاتی تناظر سے یہ بات بھی کھلتی ہے کہ پہلی گلف وار میں صدام حسین کے ذریعے کویت پر جارحیت کروانے سے اصل مقصود عراق یا کویت کی حمایت نہیں تھی بلکہ عراق کی قوت کو تہس نہس کرنا اور کویت و عراق کے معدنی ذخائر پر قبضہ کرنا تھا۔ بعد ازاں انہی مذموم مقاصد کی خاطر صدام حسین کو نشانِ عبرت بنا کر شیعہ اقلیت کو سُنّی آبادی پر مسلط کیا گیا تاکہ اُن انتہا پسندانہ مذہبی جذبات کو فروغ حاصل ہو جو اٹھارہویں صدی کے اواخر میں آلِ سعود کے ذریعے نجدی تحریک کے ابتدائی دور میں مشرقِ وسطیٰ میں مذہبی شدت پسندی کا باعث بنے تھے۔

کیسی ستم ظریفی ہے کہ آج وہی آلِ سعود انہی نظریاتی اساسات کی بنیاد پر سُنّی وہابی عسکری گروہ ''داعش'' کی پشت پناہی کا الزام اپنے اوپر لگنے بلکہ قبول کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ شاید اس لیے ہے کہ ان کے پاس ایرانی influence کو بیلنس کرنے کا اس کے سوا کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ بظاہر یہ عسکری جدوجہد توحید بمقابلہ شرک و بدعات اور قیامِ خلافت کی ایک جنگ ہے لیکن عالمی استعماری اور صیہونی قوتوں کے پاس گریٹر اسرائیل کی راہ ہموار کرنے کا اس کے علاوہ کوئی دوسرا مؤثر طریقہ اور موزوں راستہ بھی نظر نہیں آتا۔ مذہبی تشدد کو بدترین انتشار میں بدلنے سے ہی اُس بندر بانٹ کا موقع فراہم ہو سکتا ہے جس سے مشرقِ وسطیٰ کی جغرافیائی سرحدیں گریٹر اسرائیل کی تشکیل کے لیے نرم کی جا سکیں گی اور اُس ناتمام صیہونی ایجنڈے کی تکمیل ہو سکے گی۔

یہ تو اَعداء کی وہ پلاننگ ہے جس کے لیے بساط بچھائی جا چکی ہے۔ مسلمان حکمران اور انتہا پسند طبقات ہمیشہ کی طرح شطرنج کے مہروں کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ عوام کو جمہوریت کے فریب' روٹی کپڑا اور مکان کی

جہد مسلسل اور مذہبی منافرتوں میں جکڑ دیا گیا ہے تاکہ ملتِ اسلامیہ کے ان مسائل سے تعرض کا موقع ہی نہ رہے۔ لیکن ایک تدبیر اللہ کی بھی ہے جسے اپنے نظام الاوقات کے مطابق پورا ہو کر رہنا ہے۔

(**پس نوشت:** قارئین کے لیے اس بات کا اندازہ کرنا مشکل نہ ہوگا کہ متذکرہ بالا تجزیہ اصلاً عالمی سامراج کی سازشوں کو بے نقاب کرنے کے حوالے سے ایک مخصوص زاویے سے حالات وواقعات کے بیان پر مشتمل ہے۔ اسی لیے ان سطور میں سعودی حکمرانوں کی اُن مساعیِ حمیدہ کا ذکر نہیں ہے جو انہوں نے حرمین شریفین کی تولیت کی نسبت سے مختلف ذمہ داریوں کی ادائیگی اور قرآن وحدیث کی تعلیمات کے فروغ کے ضمن میں بحسن وخوبی نبھائی ہیں۔ بے شک یہ اس خاندان کا بڑا کارنامہ اور عظیم خدمت ہے جس پر اُمتِ مسلمہ ان کے زیر بار احسان ہے۔)